

ڈاکٹر ناصر عباس نیر

اسٹنٹ پروفیسر

شعبہ اُردو، اورینٹل کالج، لاہور

اردو میں مغربی تنقید کی نصابی کتب

This article aims at investigating the nature of influence of Western criticism on Urdu criticism, particularly on the books prepared for and according to the educational needs of students of Urdu literature at different times in 20th century. The author has derived on the conclusion that books in reference demonstrate multiple kinds of influence. Some books are literal translations of selected chapters or parts or paragraphs of few books of English criticism, usually secondary ones. It has been noted as an unethical fact that writers of these Urdu books have'nt bother to mention the names of books of English criticism they are relying on. The article concludes the article mentioning those few books that show the scholarly acumen of their authors.

مغربی تنقید سے اردو کا ربط ضبط بالعموم تین سطحوں پر ہوا ہے: ثقافتی، نصابی اور دانش ورانہ۔ اس ربط ضبط کی تاریخ دیکھی جائے تو ترتیب بھی یہی بنتی ہے۔ اس تاریخی ترتیب نے مغربی تنقید کے مخصوص متن اور اس متن کی مخصوص تعبیر کو اردو میں رائج کیا ہے۔ اگر یہ ترتیب مختلف ہوتی، مغربی تنقید سے اردو کا واسطہ خالصتاً دانش ورانہ طلب کے تحت اور دانش ورانہ سطح پر پڑتا تو نتائج یک سر مختلف ہوتے، مگر چوں کہ اردو ذہن، مغربی تنقید سے اُس ثقافتی فضا میں اوّل اوّل مانوس ہوا (یا کرایا گیا) جو اپنی نوعیت اور عمل میں نوآبادیاتی تھی، اس لیے 'مغربی تنقید' سے اردو کی نصابی اور دانش ورانہ وابستگی بھی اس ثقافتی فضا سے متاثر و متعین ہوئی ہے۔ بعض مقامات پر دانش ورانہ وابستگی 'نوآبادیاتی حصار' سے آزاد ہونے میں یقیناً کام یاب ہوئی ہے مگر یہ رائے نصابی سطح سے متعلق دینا بہت مشکل ہے۔

مبادا غلط فہمی پیدا ہو، یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ 'نوآبادیاتی ثقافتی فضا' کئی طریقوں سے عمل آرا ہوتی ہے، جن میں بعض بلا واسطہ اور بعض بالواسطہ ہوتے ہیں۔ براہ راست طریقے تو فی الفور نظر آ جاتے ہیں، مگر بالواسطہ حربوں کو سمجھنا اور انھیں منکشف کرنا آسان نہیں ہوتا۔ بالواسطہ حربوں میں اہم حربہ یہ ہے کہ نوآبادیاتی حقیقی ثقافتی روح تک رسائی سے، مقامی ذہن کو محروم رکھا جائے۔

نوآبادکار کبھی نہیں چاہتا کہ مقامی ذہن، نوآبادکار کی ثقافت اور فکر کی اصل تک پہنچ کر ثقافتی و فکری سطح پر اس کی برابری کے قابل ہو اور برابری کا دعویٰ کرے۔ اس کے لیے نوآبادیاتی اداروں اور آئیڈیالوجیکل سٹیٹ اپریٹس کے تحت ایک ایسی ذہنی فضا قائم کی جاتی ہے، جو نوآبادکار کی فکر کی صرف بالائی سطحوں سے سرسری تعارف کو کافی سمجھتی ہے۔ ہر چند یہ تعارف بھی براہ راست نہیں، بالواسطہ ہوتا ہے، مگر اسے مستند سمجھے جانے کی روش عام ہوتی ہے۔ یہ صورت حال اردو میں مغربی تنقید کے نصابی بیانیوں میں اپنی جامعیت کے ساتھ کارفرما ہے۔

اردو میں مغربی تنقید کے منتشر حصے ہمیں ۱۸۵۴ء کے اس تعلیمی مراسلے کے بعد نظر آنے لگتے ہیں، جس میں دیسی زبانوں کے ذریعے انگریزی خیالات کی ترویج پر زور دیا گیا تھا۔ چنانچہ سکول کی سطح پر اردو نصابات کی جو کتب تیار کی گئیں ان میں مغربی تنقید کے بعض تصورات سامنے آنے لگے تھے، زیادہ تر راست اخذ و ترجمہ کی صورت۔ محکمہ تعلیم کی ان کوششوں کا ساتھ انجمن مطالب مفیدہ پنجاب (قیام ۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء) نے خاص طور پر دیا۔ محمد حسین آزاد نے نئی شاعری کے سلسلے میں جو لیکچر انجمن پنجاب میں دیے، وہ ڈاکٹر لائٹر اور کرٹل ہالرائیڈ کے 'مغربی تنقیدی خیالات' (جنہیں ایک جامع لفظ 'نچرل شاعری' کا نام دیا جاسکتا ہے) پر مشتمل تھے۔ خود حالی کی مغربی تنقید کے تصورات سے آشنائی، انجمن پنجاب اور گورنمنٹ پنجاب بک ڈپو کی مرہون ہے جہاں وہ انگریزی سے اردو میں ترجمہ نصابی کتب کی زبان کی اصلاح کیا کرتے تھے۔ مغربی طرز کی 'نچرل شاعری' سے متعلق تصورات کی بھر پور حمایت علی گڑھ تحریک نے کی۔ آگے بیسویں صدی کے اوائل میں مغربی تنقید سے نصابی ضرورت کے تحت اخذ و ترجمہ کا سلسلہ جاری رہا۔ محی الدین قادری زور کی روح تنقید (۱۹۲۷ء)، حامد اللہ افسر کی نقد الادب (۱۹۳۲ء)، عبدالقادر سروری کی جدید شاعری (۱۹۳۲ء) نصابی نوعیت ہی کی کتب ہیں۔ آزادی کے بعد جب اردو میں ایم اے سطح کی تدریس کا آغاز ہوا، اور مغربی تنقید کو اس کے نصاب کا حصہ بنایا گیا تو نئی نصابی کتب کی ضرورت بھی محسوس ہوئی۔ اس ضرورت کے تحت لکھی گئی کتابوں میں ڈاکٹر سلام سندیلوی کی ادب کا تنقیدی مطالعہ (۱۹۶۳ء)، ملک احسن اختر کی تنقیدی نظریے (۱۹۶۶ء)، سجاد باقر رضوی کی 'مغرب کے تنقیدی اصول' (۱۹۶۶ء)، ڈاکٹر سید عبداللہ کی اشارات تنقید (۱۹۶۶ء)، ڈاکٹر محمد سلیم کی کلاسیکی مغربی تنقید (۱۹۷۵ء)، ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقیدی دبستان (۱۹۷۴ء)، ڈاکٹر جمیل جالبی کی ارسطو سے ایلینٹ تک (۱۹۷۵ء) عابد صدیق کی مغربی تنقید افلاطون سے ایلینٹ تک (۱۹۸۳ء) اور جیلانی کامران کی مغرب کے تنقیدی نظریے (۲۰۰۰ء) قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ، کلیم الدین احمد کی اصول تنقید اور عملی تنقید (جو آئی اے رچرڈز کی کتابوں Principles of Literary Criticism اور Practical Criticism کی طرز پر لکھی گئیں)، ڈاکٹر شارب ردولی کی جدید اردو تنقید — اصول و نظریات (۱۹۶۸ء) اور وزیر آغا کی تنقید اور جدید اردو تنقید (۱۹۸۹ء) بھی اہم کتب ہیں۔ یہ خالص نصابی ضرورت کے بجائے بڑی حد تک دانش ورانہ اور تحقیقی ضرورت کے تحت وجود میں آئی ہیں، تاہم انہیں

اردو میں نصابی ضرورتوں کے تحت پڑھا جاتا ہے۔ آخر الذکر کتابیں فی الوقت ہماری بحث سے خارج ہیں۔

مذکورہ بالا کتب کا محرک تصنیف، اعلانیہ یا مضمر طور پر، تدریسی ہے۔^(۱) عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ تدریسی محرک ایک محدود محرک ہے۔ یہ مؤلف کو عالمانہ کارکردگی ظاہر کرنے کا موقع نہیں دیتا۔ نظریات ان کی تاریخ اور ارتقا کو پوری تحقیق اور تفصیل سے پیش کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ حقیقت حال سے زیادہ معذرت خواہی ہے، جو اس معاشرے کی طرف سے پیش کی جاتی ہے، جو تدریس کا وسیع تر مقامی و عالمی ثقافتی سطحوں پر تصور تشکیل دینے کے ارتقائی مرحلے تک نہیں پہنچا ہوتا۔ چنانچہ محدود تدریسی محرک کے تحت ایسی کتب تالیف ہوتی ہیں، جن میں نظریات کو ترجمہ، تسہیل و تلخیص، اور شرح کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے کہ مقصود طلباء تک ان نظریات کے بنیادی مفہیم کی ترسیل ہوتی ہے۔ اپنی جگہ پر نہ یہ مقصد برا ہے نہ یہ طریقے معیوب ہیں۔ اعتراض کا محل وہاں ہے جہاں ترجمہ ماخذ کی نشان دہی کے بغیر ہوا اور تسہیل، شرح و تعبیر میں نظریات کے اصل متن سے روگردانی کی جائے۔ ان کتب میں فکر کی اور تکنیکی کوتاہی کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے، مگر مغربی فکر کو اور بجنل انداز میں پیش کیا گیا ہے یا نہیں؟ اس امر کا جائزہ لینے میں تو کوئی حرج نہیں ہونا چاہیے۔

بغیر حوالوں کے انگریزی اقتباسات کے تراجم اپنی تحریروں میں شامل کرنے کے جس رجحان کا آغاز حالی و شبلی سے ہوا، وہ ان کتب میں بھی بعض مقامات پر موجود ہے۔ یہ کتب مغربی تنقید اور ادب کی تاریخ پر لکھی گئی ان انگریزی کتب کی مدد سے تیار کی گئی ہیں، جن کی حیثیت ثانوی ماخذ کی ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ مذکورہ بیش تر کتب کی تصنیف میں مغربی تنقید کے بنیادی متون سے بہت کم رجوع کیا گیا ہے۔ زیادہ تر جارج سنٹیس بری، جارج وٹسن، ولیم ہنری ہڈسن، رینے ویلک، ڈیوڈ ڈیشر، سکاٹ جیمز اور لائل ٹرانگ کی کتابوں پر انحصار کیا گیا ہے۔ ان کتابوں سے صفحات کے صفحات، بغیر حوالے کے شامل کر لیے گئے ہیں۔

صرف چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

William Henry Hudson

ڈاکٹر سلیم اختر

"...a great French Critic already named --- M. Edmond Scherer. Taking up the study of Paradise Lost, Scherer was struck by the diametrically opposed opinions of it of two such men as Voltaire and Macaulay, of whom the one indulged in unmeasured disparagement, the other is unqualified laudation.

”تاریخی تنقید کا باقاعدہ آغاز فرانسیسی نقاد ایڈمنڈ شیرر سے سمجھا جاتا ہے۔ اس نے ملٹن کی Paradise Lost پر والٹر اور میکالے کی تنقیدی آرا کا مطالعہ کیا تو دونوں کے فیصلوں میں قطبین کا بعد پایا۔ دہر یہ والٹر نے اس کی دل کھول کر مذمت کی تو میکالے نے اسے غیر مشروط طور پر سراہا۔ اس سے اسے تنقید میں ایسے طریقے کی جستجو ہوئی جس کے ذریعے ذاتی پسند و ناپسند سے بالا تر ہو کر ادب پاروں کا مطالعہ کیا جاسکے۔ ایسا طریقہ جس میں تحقیقات کو سمجھا تو جائے، مگر ان پر فیصلہ نہ صادر کیا جائے۔ بالفاظ دیگر یہ تنقید بھی فیصلہ اور معیار پرستی کے خلاف ایک رد عمل ہے۔ ایسا رد عمل، جس میں اس کے بقول:

... How then shall we ourselves proceed in the hope of establishing a point of view beyond personal feeling --- a point of view from which, irrespective of any question whether we ourselves enjoy or do not enjoy the poem, we may see *Paradise Lost* as it really is? By adopting Scherer replies, the modern historical method ... Its aim is "to account for a work from the genius of its author, and from the turn this genius has taken from the circumstances amidst which it was developed. Our first business in approaching the study of *Paradise Lost*, therefore, will be to eliminate as far as possible all personal bias, arising either from individual temperament and predilections or from the literary habits and tastes of our own time and circle, and to 'account for' the poem --- to explain it as it is, in all its varied characteristics of matter and style... But here Scherer parts company with those who, like Mr. Moulten, decline to advance from interpretation to judgement. "Out of these two things," he maintains --- "the analysis of the writer's character and the study of his age-there spontaneously issues the right understanding of his work:" and this right understanding in turn furnishes us with a criterion by which to estimate its position and value."

(*An Introduction to the Study of Literature*, p. 272-73)

”کسی مصنف کی صلاحیتوں کا جائزہ لیتے ہوئے اس امر کا تعین بھی کرنا کہ اس نے اپنے عہد کے حالات سے متاثر ہو کر اپنی صلاحیتوں کا رخ کس طرف موڑا۔“

ایک اور موقع پر بھی اس نے ان خیالات کا اظہار کیا: مصنف کے کردار اور شخصیت کی تفہیم اور اس کے عصر کا تجزیہ — ان دونوں سے ہی اس کی تخلیقات کو درست طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔“

شیر نے اس امر پر بھی زور دیا کہ کسی بھی ادب پارہ کے تنقیدی مطالعے میں سب سے پہلے تو ذاتی پسند و ناپسند اور اپنے عہد کے ادبی تعصبات سے بلند ہو کر اس کا اس کی انفرادی حیثیت میں جائزہ لینا ہوگا۔ اس مقصد کی بطریق احسن انجام دہی کے لیے ادب پارے کا مفصل تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ ادیب کی ذاتی زندگی، اس کے ماحول اور زمانے میں سیاسی، سماجی تمدنی اور ادبی عوامل کا جائزہ لیتے ہوئے یہ واضح کرنا ہوگا کہ ان سب نے اس کے تحقیقی شعور پر مثبت یا منفی کس طرح اثر اندازی کی، رچرڈ مولٹن (Richard Moulten) کی مانند شیر بھی تعین قدر اور درجہ بندی کے خلاف ہے۔ اس کے خیال میں نقاد کا یہ فریضہ نہیں کہ وہ ادب پارے کی قیمت متعین کرتا پھرے۔ نقاد کا کام تو یہ ہے کہ وہ غیر جانب داری سے تاریخی اور دیگر شخصی عوامل کی روشنی میں ادب پارے کا تجزیہ کرنے کے بعد اس کی قدر و قیمت کا فیصلہ قاری پر چھوڑ دے۔“

(تنقیدی دبستان، ص ۳۳ تا ۳۶)

لائل ٹرلنگ

"...many interpretations of it have been offered by poets and critics. Professor Garrod, for example, interprets it to mean merely that insofar as a work possesses organic unity it is a criticism of the chaos of life; he quotes Edward Caird who said that "literature is a criticism of life exactly in the sense that a good man is a criticism of a bad one." This would bring Arnold's phrase close to Sir Philip Sidney's "golden world" of art which is a model and corrective for the "brazen world;"..."

(*Mathew Arnold*, p. 194)

سکاٹ جیمز

"There is a kind of criticism which exists before art itself, and is presupposed in all art, just as there is a kind of criticism which follows art, taking art as its subject-matter. The distinction is that between the criticism of life, which comes first, and the criticism of the criticism, which comes second in order of thought, though perhaps almost simultaneously in order of time. You cannot criticize a work of art until the work of art exists."

(*The Making of Literature*, p. 16)

ڈاکٹر ملک حسن اختر

”آرنلڈ نے ادب کو تنقید حیات قرار دیا ہے۔ آرنلڈ کا یہ فقرہ جتنا مشہور ہے، اتنا ہی اسے لوگ کم سمجھتے ہیں، چنانچہ مختلف نقادوں نے اس کی مختلف تشریح کی ہے۔ پروفیسر گیرڈ (Prof. Garid) نے تنقید حیات کا مطلب یہ لیا ہے کہ کسی ادب پارے میں عضوی وحدت (Organic Unity) پائی جائے۔ ہر ادب پارہ اس طرح زندگی کے ان انتشار کی تنقید ہے۔ وہ ایڈورڈ گیرڈ (Edward Garid) کے یہ الفاظ دہراتے ہیں کہ ”ادب بالکل اس طرح زندگی کی تنقید ہے، جس طرح ایک اچھا آدمی بُرے آدمی کی تنقید ہے“، اس مفہوم کو مان لیں تو آرنلڈ کا یہ فقرہ ہمیں سڈنی کی یاد دلاتا ہے، جس کے نزدیک ایک اور سنہری دنیا ہے، جو ایک مکمل نمونہ ہونے کی وجہ سے ہمارے لیے سبق آموز ہے۔“

(تنقیدی نظریہ، ص ۱۲۲)

سجاد باقر رضوی

”..... ایک تنقید ایسی ہوتی ہے جو فن سے پہلے وجود میں آتی ہے۔ جب ہم شاعری یا ادب کو تنقید حیات کہتے ہیں تو ہماری مراد اس تنقید سے ہوتی ہے۔ پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس تنقید میں جو فن سے پہلے پیدا ہوتی ہے اور اس میں جو فن کے بعد ہوتی ہے اور دوسری اس تنقید کی تنقید۔ فن پارے کے وجود کے لیے زندگی پر تنقید ضروری ہے۔“

(مغرب کے تنقیدی اصول، ص ۳)

"At one extreme we may have a poem, whose excellence lies in its beauty, at the other a dictionary, which is merely accurate or inaccurate... The main distinction is that laid down by De Quincy between the "literature of knowledge" and the "literature of power"... Both kinds of literature may be concerned with truth, but they arrive at it in different ways --- the first by a judgement about it, the second by intuition."

(*The Making of Literature*, p. 22-4)

نظریات کی وضاحت اور تاریخ پیش کرنے کی غرض سے ثانوی مآخذ پر انحصار کوئی قابل رشک بات نہیں ہے، مگر جب ان ثانوی مآخذ کے مواد کو بھی اپنا مواد بنا کر پیش کرنے کی روش اختیار کر لی جائے تو صورتِ حال کافی گھمبیر ہو جاتی ہے۔ مصنفین کی علمی اور اخلاقی ثقافت دونوں معرضِ سوال میں آ جاتی ہیں۔ ”ترجمہ نگاری“ کی اس روش کا اہم پہلو یہ ہے کہ ترجمہ شدہ عبارت کی درست اور مکمل تفہیم نہیں ہوتی۔ اصل انگریزی عبارت میں بحث کا سیاق و سباق ہوتا ہے، ”ترجمے“ میں یہ شامل نہیں ہوتا، چنانچہ قاری کو جھٹکا لگتا ہے۔ مثلاً ملک احسن اختر نے مندرجہ بالا اقتباس ٹرلنگ کی کتاب کے اس حصے سے لیا ہے، جہاں وہ بحث اٹھاتے ہیں کہ آرنلڈ کے قول ”ادب (شاعری) تنقید حیات ہے“، کو کوئی حقیقی شاعر، خواہ اس کے کچھ فلسفیانہ اور سیاسی مقاصد ہوں، شاعری کی جامع تعریف قرار نہیں دے سکتا۔ وہ اس بحث کو آگے بڑھانے کے لیے دو پروفیسروں (جن کے ناموں کو ملک احسن اختر نے غلط درج کیا ہے) کی تشریحات کا حوالہ دیتا ہے۔ اور بعد ازاں آرنلڈ کے اس قول سے متعلق اپنی رائے پیش کرتا ہے۔ یہ رائے دراصل آرنلڈ کی مجموعی تنقیدی فکر کے تناظر میں ہے۔

"He is stating the function of poetry, at least what he considers to be its chief function. Criticism is not what poetry is; it is what poetry does. How it does it is another matter."

(*Mathew Arnold*, p. 196)

لطف کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ملک احسن اختر بھی آرنلڈ کے اس قول سے متعلق اپنی رائے پیش کرتے ہیں۔ یہ ”رائے“ لائنل ٹرلنگ کی وضاحت اور ملک صاحب کی اپنی فکر رسا کا ایک ایسا ملغوبہ ہے، جو داد سے بالا تر ہے۔

بہر حال آرنلڈ کا مطلب اس فقرے سے ہمارے خیال میں یہی ہے کہ ادیب زندگی کی تنقید اچھے اور بُرے میں تمیز پیدا کر کے کرتا ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ آرنلڈ یہاں ادب کی ماہیت پر روشنی نہیں ڈال رہا، بلکہ وہ ادب کے مقصد کو واضح کر رہا ہے۔ یعنی بتاتا ہے کہ ہم کو کس طرح زندگی گزارنی چاہیے یہ سوال اخلاقیات سے تعلق رکھتا ہے، یعنی نقاد کی طرح ادیب بھی مصلح کے فرائض سرانجام دیتا ہے۔

(تنقیدی نظریے، ص ۱۲۲-۱۲۳)

اردو تنقید نے آرنلڈ کے اس قول سے کیا کیا مطالب وابستہ کیے ہیں، یہ بحث تو آگے آرہی ہے۔ یہاں صرف اتنا کہنا ہے کہ آرنلڈ کے نزدیک تنقید ”ایچھے اور بُرے میں تمیز“ کے اخلاقی تصور سے کہیں آگے کی چیز ہے۔

نظریات کی تسہیل و تلخیص، بلاشبہ بنیادی نصابی ضرورت ہے۔ اسے ان کتب میں بہ طور خاص مد نظر رکھا گیا ہے۔ زیر مطالعہ کتب میں مغربی تنقیدی نظریات کی تسہیل و تلخیص کی دل چسپ روداد سامنے آتی ہے۔ کلاسیکی مغربی نظریات کی تسہیل اور تلخیص کرتے ہوئے اردو نقاد بالعموم کسی وقت کا شکار نہیں ہوئے مگر جہاں جدید مغربی تنقیدی نظریات کی تسہیل کا مرحلہ آیا ہے، وہاں اکثر نقادوں کا سانس اکھڑتا محسوس ہوا ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ کلاسیکی مغربی تنقید کی پس منظری فکر یونانی ہے، جس سے اردو ذہن اپنے عربی پس منظر کی وجہ سے بالعموم مانوس ہے، جب کہ جدید تنقید نہ صرف ان علماتی اصولوں کو توڑتی ہے، جن کے تحت کلاسیکی تنقید ظہور پذیر ہوتی ہے، جدید تنقید، ان کی جگہ نئے علماتی اصول بروئے کار لاتی ہے، بلکہ جدید تنقید متعدد اور تغیر پذیر تناظرات کی علم بردار بھی ہے۔ جدید تنقید کے علماتی اصولوں اور تناظر کو ملحوظ رکھے بغیر، اس کے نظری مباحث کی تفہیم ہی ممکن نہیں، تسہیل تو تفہیم کے بعد کا مرحلہ ہے، زیر مطالعہ کتب میں عموماً جہاں نظری مباحث کو سادہ و سلیس انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، وہاں (مذکورہ وجوہ سے) تسہیل کی جگہ الجھنیں اور بوالعجیباں دکھائی دیتی ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اشارات تنقید میں ”تنقید کیا ہے؟“ کی بحث، تنقید کی چند مغربی تعریفات (جو انگریزی لغات، برطانوی و امریکی انسائیکلو پیڈیا، ایڈمنڈ گوس، آئی اے رچرڈز، ٹی۔ ایس۔ ایلٹ، رچرڈ مولٹن سے ماخوذ ہیں) کی بنیاد پر اٹھائی ہے۔ وہ ان تعریفات کی سہل اسلوب میں تفریح کرتے ہیں۔ یہ تفریح بڑی حد تک ہڈن کی کتاب سے ماخوذ ہے، مگر حوالہ موجود نہیں۔ سید صاحب نے حوالہ مولٹن کی کتاب *Shakespeare as a Dramatic Artist* کا دیا ہے، مگر یہ حوالہ بھی ہڈن کی کتاب سے لیا گیا ہے۔ اس کی شہادت اس بات سے ملتی ہے کہ سید صاحب نے وہی باتیں درج کی ہیں، جو ہڈن کے یہاں موجود ہیں۔ ہڈن نے مولٹن کے حوالے سے سائنسی اور تشریحی تنقید کے امتیاز پر لکھا ہے۔ سید صاحب بھی اس امتیاز کو اجاگر کرتے ہیں:

مولٹن نے تنقیدی فیصلوں کی موجودگی کو تسلیم کرنے کے باوجود یہ کہا ہے کہ تنقید کا عمل جو کچھ بھی ہے، اس کے دو طریقے قدیم زمانے سے مروج ہیں۔ ایک تو سائنسی طریقہ، یعنی ادب پارے کا مطالعہ کر کے اس کے مطالب کو دوبارہ اچھی طرح پیش کرنے اور مصنفین وغیرہ کے بارے میں تحقیق و جستجو (Investigation) کا طریقہ۔ دوسرا عقلی طور پر، پرکھ تول کر، فیصلہ صادر کرنے (Judgement) کا طریقہ۔“

(اشارات تنقید، ص ۷۷، ۸)

اس اقتباس میں درج دونوں باتیں، اپنے اصل انگریزی ماخذ کے اعتبار سے اور اصولی طور پر درست نہیں ہیں۔ اول یہ کہ سائنسی اور ”پرکھ تول کر فیصلہ کرنے“ کے دونوں طریقے قدیم سے نہیں ہیں۔ سائنسی طریقہ نیا ہے اور تشریحی انداز نقد نسبتاً پرانا ہے، نیز سید صاحب دونوں طریقوں کا جو مفہوم بغرض تسہیل و تلخیص پیش کیا ہے، وہ ان کی اپنی اختراع ہے، ذرا ہڈن کی وضاحت ملاحظہ کیجیے:

...inductive criticism will examine literature in the spirit of pure

investigation; looking for law of art in the practice of artist, and treating art like the rest of nature.

اور

Judicial criticism proceeds upon the hypothesis that there are fixed standards' by which literature may be tried and adjudged.

(An Introduction to the Study of Literature, p. 270-71)

اپنی کتاب کے اگلے صفحے پر سید صاحب نے سائنسی تنقید کی مزید صراحت کی ہے:

تنقید کو سائنس یا سائنسی عمل کے تابع ایک شعبہ، کہنے والے دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ تنقید، سوا اس کے کچھ نہیں کہ مصنف نے جو کچھ لکھا ہے، اس کو ایک خاص ترتیب سے یا تلخیص سے بلا کم و کاست، اپنی رائے یا ترجیحی سلوک کے بغیر دوبارہ بیان کر دیا جائے، مگر یہ طریق کار کسی خاص علم و فضل کا یا ناقدانہ بصیرت کا یا ادب فہمی کا طلب گار نہیں۔ اخبار کا ہر ذی فہم قاری یا کوئی شوقین کتاب خواں، جسے کتابوں کے نوٹ رکھنے کی عادت ہو، یہ کامیابی سے کر سکتا ہے۔

(اشارات تنقید، ص ۹)

نظریات کی تسہیل (اور تلخیص) کا بنیادی قاعدہ یہ ہے کہ نظریات کے جوہر اصلی کو قائم رکھتے ہوئے انہیں روزمرہ کی مانوس زبان میں اختصار سے پیش کیا جائے۔ نظریات کی تکنیکی اور اصطلاحاتی زبان، انہیں دقیق اور نامانوس بناتی ہے۔ روزمرہ کی زبان میں انہیں پیش کرنے سے گویا اصطلاحات اور دلائل کی پیچیدگی کو نظریے سے الگ کر دیا جاتا ہے۔ یہ ایک اہم سوال ہے کہ اس عمل سے نظریے کی صحت کتنی متاثر ہوتی ہے؟ اگر یہ سمجھا جائے کہ اصطلاحات اور پیچیدہ دلائل کے بغیر بھی کوئی نظریہ اپنی اصل کو قائم رکھنے میں کام یاب ہوتا ہے تو اس کا لازمی مطلب یہ ہے کہ اصطلاحات اور دلائل نظریے کا فاضل مواد یا اس کا آرائشی عنصر ہیں جنہیں الگ کر دینے کے باوجود نظریے کی اصل برقرار رہتی ہے، اصل یہ ہے کہ تسہیل کے نتیجے میں نظریے کی ساری سطحوں کو ان کی اصل شکل میں برقرار رکھنا محال ہوتا ہے۔ سید صاحب نے مندرجہ بالا اقتباسات میں سائنسی اور تشریحی انداز نقد کی جو تسہیل پیش کی ہے، اس میں زبان تو یقیناً مانوس ہے اور اصطلاحات سے مبرا اور روزمرہ کے قریب ہے، مگر نظریات کا اصل جوہر قائم نہیں رہ سکا۔ سید صاحب کی تشریحات اصل متن سے مطابقت ظاہر کرنے سے قاصر ہیں۔ پروفیسر رچرڈ مولٹن کا سائنسی تنقید کا نظریہ ہرگز یہ مفہوم نہیں رکھتا کہ کسی متن کو ”خاص ترتیب سے یا تلخیص سے بلا کم و کاست“ بیان کر دیا جائے۔ یہ انداز شرح و تشریح کا ہے، جب کہ سائنسی تنقید ادبی متن کا مطالعہ اسی طرح کرتی ہے، جس طرح ایک سائنس دان فطرت کے کسی مظہر کا مطالعہ کرتا ہے۔ دونوں اپنے معروض میں مضمر اصولوں کی تلاش کرتے ہیں۔ انہیں صرف اس بات سے غرض ہوتی ہے کہ فطرت کے کسی مظہر یا ادبی متن کو کن عناصر نے کن اصولوں کے ربط باہم سے مخصوص شکل دی ہے؟ انہیں اپنے معروض کی اخلاقی یا افادی قدر سے بحث نہیں ہوتی اور ظاہر ہے اس کے لیے اچھے خاصے علم و فضل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اخبار کا ایک ذی فہم قاری اگر غالب کی غزل کے تشکیلی اصولوں کو مرتب کرنے

کا اہل ہوتا تو یہ ادبی تنقید کا معجزہ ہوتا۔ یہاں یہ اعتراف کیا جانا چاہیے کہ اپنے دوسرے عیوب سے قطع نظر، سجاد باقر رضوی کی مغرب کے تنقیدی اصول تسہیل و تلخیص میں کام یاب ہے۔ یہ اصل انگریزی متن سے بالعموم روگردانی نہیں کرتی۔^(۲)

زیر مطالعہ کتب کے مؤلفین نے مغربی نظریات کی شرح اور تعبیر میں خوب سرگرمی اور آزادی کا مظاہرہ کیا ہے۔ تقریباً تمام کتب^(۳) میں بغیر حوالوں اور حواشی کے نظریات کی توضیح اور تعبیر کی گئی ہے۔ نظریات کے اصل متن کو پیش کرنے کا کہیں اہتمام ہے نہ کسی مغربی نقاد کے نظریات کے ارتقا اور تناظر کو مجملاً ہی سہی، پیش کرنے کی ضرورت ہی محسوس کی گئی ہے۔ اس صورت میں مؤلف ان تمام پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے جو نظریات کو ان کے تناظر میں پیش کرنے کی صورت میں عائد ہوتی ہیں۔ اس آزادی کے نتیجے میں مؤلف نظریات کی شرح اور تعبیر من مانے انداز میں کرتا ہے۔

یہاں تمام مغربی نظریات کی شرح اور تعبیر کا جائزہ لینے کی گنجائش نہیں۔ صرف آرنلڈ کے نظریے ”شاعری تنقید حیات ہے“ کی تعبیر کو بہ طور مثال پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ایک مثال اس عمومی ذہنی فریم ورک کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے، جو دوسرے مغربی تنقیدی نظریات کی تعبیر میں کارفرما رہا ہے۔ آرنلڈ کے نظریے کو منتخب کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس نے اردو تنقید کو دیگر مغربی نظریات کے مقابلے میں زیادہ متاثر کیا ہے۔ اردو کی مارکسی اور غیر مارکسی دونوں طرح کی تنقید آرنلڈ کے اس نظریے کو عزیز رکھتی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اسے زیر مطالعہ کتب میں کس مفہوم میں لیا گیا ہے؟

اردو تنقید میں آرنلڈ کے نظریے کی بازگشت بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں سنائی دینے لگی تھی۔ نیاز فتح پوری، حامد اللہ افسر کی تحریروں میں آرنلڈ کا ذکر آنے لگا تھا۔ تاہم عبدالقادر سروری پہلے اردو نقاد ہیں جن کی کتاب جدید اردو شاعری (۱۹۳۲) میں اس نظریے کی شرح پیش کی گئی تھی۔ یہ کتاب بھی اصلاً طلباء کی درسی ضرورت کی خاطر تصنیف ہوئی تھی۔

میتھیو آرنلڈ کے بعد شاعری کو ”تنقید حیات“ یا حیات کی ترجمانی سمجھنے کا دستور عام ہو گیا ہے۔ شاعری حقیقت میں حیات کی تفسیر ہے اور تفسیر اس خاص نوعیت سے، جس طرح حیات کا نقش شاعر کے دل پر مرثم ہوتا ہے، اس ترجمانی یا تفسیر میں شعریت، اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب اس میں تخیل اور جذبات دونوں موجود ہیں۔

(جدید اردو شاعری، ص ۱۴)

میتھیو آرنلڈ کا یہ مدعا ہرگز نہیں تھا جو عبدالقادر سروری نے بیان کیا ہے۔ ”تنقید حیات“ کو حیات کی ترجمانی اور حیات کی تفسیر کہنا، من مانی تفسیر ہے، جو تنقید کے لغوی اور عمومی مفہوم کو پیش نظر رکھ کر کی گئی ہے۔ ہڈن کے اثرات کے تحت اردو تنقید میں یہ خیال عام ہوا کہ ادب زندگی کی ترجمانی اور تفسیر ہے اور تنقید، ادب کی ترجمانی اور تفسیر ہے۔ لہذا شاعری کا تنقید حیات کا مطلب، حیات کی ترجمانی و تفسیر ہے۔ ظاہر ہے یہ مفہوم آرنلڈ کے نظریے کے اصل تناظر کو پس پشت ڈالنے کے نتیجے میں قائم کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ آرنلڈ کے اس نظریے کی شرح میں رقم طراز ہیں:

آرنلڈ نے نقاد کے فرائض کی جو فہرست پیش کی ہے، اس میں ایک ہدایت یہ ہے کہ وہ مخلصانہ انداز میں ادب پارے کو غور سے پڑھے اور اس سے اچھی طرح باخبر ہو کر اس کے معارف و معانی کو دوسروں تک پہنچائے اور سعی کرے کہ بہترین افکار دنیا میں پھیل جائیں۔ ایک دوسرا فرض یہ ہے کہ ایسی فضا تیار ہو جس میں مستقبل کا اعلیٰ ادب

پرورش پاسکے۔

(اشارات تنقید، ص ۱۰۱)

آرنلڈ کا وہ جملہ ملاحظہ فرمائیے، جس کی تعبیر سید صاحب نے کی ہے۔

Literary Criticism is a disinterested endeavour to learn and propagate the best that is known and thought in the world, and thus to establish a current of fresh and true idea.

(Essay in Criticism 1st Series, p. 37)

سید صاحب نے disinterested endeavour کو مخلصانہ انداز کہا ہے۔ لفظی مفہوم تو کسی حد تک درست ہے مگر آرنلڈ تنقید کو ”کسی ادب پارے کا مخلصانہ انداز میں مطالعہ“ نہیں قرار دیتا۔ سجاد باقر رضوی نے آرنلڈ کے موقف کی درست نشان دہی کی ہے کہ اُس نے ”تنقید کو پوری زندگی کی تنقید کے عظیم تر منصب پر فائز کیا۔“ (مغرب کے تنقیدی اصول، ص ۲۶۳) آرنلڈ نے تنقید کو اس کے لغوی مفہوم (کھرے کھوٹے میں امتیاز) اور محدود اصطلاحی مفہوم (تشریح و تعین قدر) سے آزاد کیا اور اسے زندگی اور کلچر کی ایک ارفع سرگرمی قرار دیا۔ آرنلڈ جب شاعری کو تنقید حیات قرار دیتا ہے تو اس کے پیش نظر تنقید کا وسیع کلچرل مفہوم پیش نظر ہوتا ہے۔ گویا آرنلڈ کے اس نظریے کا داخلی تناظر ہے، جسے آرنلڈ کے مجموعی تنقیدی نظام کو ملحوظ رکھے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔ جیلانی کامران کے یہاں آرنلڈ کے مذکورہ نظریے کی ”مثالی مکتبی تعبیر“ ملتی ہے، یعنی ایک ہی بات کو گھما پھرا کر تکرار کے ساتھ کہنا۔

آرنلڈ کی اصطلاح میں تنقید حیات سے زندگی کے حالات اور واقعات پر تصورات کا اطلاق مراد ہے۔ انگریزی میں اس عمل کو Application of Ideas to life کہا گیا ہے یعنی زندگی کو تصورات کی روشنی میں کیسے سمجھا گیا ہے۔ تنقید حیات سے زندگی کو فکری اعتبار سے سمجھنا مراد ہے۔ حالات اور واقعات کی تشریح کرنے کو تنقید حیات کہا جا تا ہے۔ تشریح (Interpretation) کے طریق کار سے جو نتائج دستیاب ہو سکتے ہیں یہ ہیں کہ زندگی کیا ہے؟ حالات و واقعات کی صورت ایسی کیوں ہے اور کیسے ہے؟ لیکن تنقید حیات سے شاعری کے وہ بہتر خصائص بھی آشکار ہو سکتے ہیں جن کے ساتھ دل جوئی اور دست گیری کی توقعات وابستہ ہیں۔

(مغرب کے تنقیدی نظریے، جلد دوم، ص ۱۱۰-۱۰۹)

اس اقتباس پر تبصرے کے بجائے یہ مناسب ہے کہ آرنلڈ کے نظریے کو اس کے حقیقی تناظر میں پیش کر دیا جائے۔

آرنلڈ نے پہلے (۱۸۶۴) تمام ادب کو اور بعد ازاں (۱۸۷۹) صرف شاعری کو تنقید حیات کہا تھا، اپنے تنقیدی مقالات کی دوسری جلد میں اس نے یہ قصہ دہرایا ہے۔

I have seen it said that I allege poetry to have for its characteristic this: that it is a criticism of life; and that I make it to be thereby distinguished

from prose, which is something else. So far from it, that when I first used this expression, a criticism of life, now many years ago, it was to literature in general that I applied it, and not to poetry in special. 'The end and aim of all literature', I said, 'is, if one considers it attentively, nothing but that; a criticism of life.' And so it surely is; the main end and aim of all our utterance, whether in prose or in verse, is surely a criticism of life. We are not brought much on our way, I admit, towards an adequate definition of poetry as distinguished from prose by that truth; still a truth it is, and poetry can never prosper if it is forgotten. In poetry, however, the criticism of life has to be made conformably to the laws of poetic truth and poetic beauty.

(*Essays in Criticism, Second Series*, p. 186-7)

شاعری، شاعرانہ جمالیات اور شاعرانہ صداقت کے قوانین سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے زندگی کی تنقید کیوں کر ہو سکتی ہے؟ یہ وہ بنیادی سوال ہے، جسے معرض بحث میں نہیں لایا گیا، مگر یہی وہ سوال ہے جو آرنلڈ کے نقطہ نظر کی درست تفہیم کے لیے کلید کا درجہ رکھتا ہے۔ شاعرانہ جمالیات اور صداقت، شاعری کے روایتی عناصر ہیں: ان کے بغیر شاعرانہ متن وجود پذیر نہیں ہوتا۔ (آرنلڈ کی فکر کا بڑا حصہ یوں بھی روایتی ہے)۔ آرنلڈ شاعری کے روایتی عناصر میں نیا عنصر یعنی تنقید حیات، اس شرط پر شامل کرتا ہے کہ وہ روایتی عناصر سے ہم آہنگ ہو، یا انہی عناصر کے حدود میں رہتے ہوئے تنقید حیات کا عمل کیا جائے۔ اگلا سوال یہ ہے کہ وہ تنقید کا لفظ کس مفہوم میں برت رہا ہے؟ کیا وہ اس سے وہ طریق کار مراد لے رہا ہے، جو ادبی متن کے تنقیدی مطالعے میں برتا جاتا ہے کہ شاعری اس طرح زندگی (کے متن) کا مطالعہ کرتی ہے، جس طرح تنقید شاعری (کے متن) کا مطالعہ کرتی ہے؟ عیوب و محاسن کی تلاش، تعبیر، تجزیہ اور تعین قدر؟ اردو تنقید میں تو بالعموم یہی کچھ سمجھا گیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ آرنلڈ نے 'تنقید حیات' کا تصور فرانسیسی اور جرمن فکر سے لیا گیا ہے۔ آرنلڈ پر ساں یو کے گہرے اثرات ہیں۔ جارج واٹسن نے لکھا ہے کہ آرنلڈ نے تنقید حیات کی ترکیب ساں یو کی استعمال کردہ اصطلاح Philistine سے اخذ کی ہے، جو جرمن لفظ Philister سے ماخوذ ہے (Literary Critics, P 153) آرنلڈ اس کا ترجمہ disinterested endeavour کرتا ہے۔ یعنی تنقید ایک ایسی بے غرض سعی ہے، جو اشیا کی اصل تک پہنچنے کی خواہش کرتی ہے۔ وہ اشیا کو ان کی افادی قدر کے زاویے سے جانچنے کی بجائے، ان کی حقیقی اور نفسی قدر کے حوالے سے پہچانتی ہے اور اس طرح بہترین خیالات جمع کرتی ہے۔

... real criticism obeys an instinct prompting it to try to know the best that is known and thought in the world, irrespectively of practice, politics, and everything of the kind; and to value knowledge and thought as they approach this best, without the intrusion of any other considerations whatever.

(*Pages from the Prose writings of Mathew Arnold*, p. 9)

مگر تنقید محض خیالات جمع نہیں کرتی، انھیں معاشرتی زندگی میں کچھ اس طور پھیلاتی بھی ہے کہ معاشرتی زندگی ایک نئے نظام خیال کی علم بردار ہو جاتی ہے۔ شاعری اس نظام خیال کی تجسیم کرتی ہے۔ آرنلڈ نے یہ موقف پیش کیا کہ شاعری خیالات تخلیق نہیں کرتی، موجود خیالات کے نظام کو بروئے کار لاتی ہے۔ آرنلڈ کے یہاں خیالات کے سلسلے میں ایک درجہ بندی موجود ہے۔ فلسفہ خیالات کو جنم دیتا ہے، تنقید بہترین خیالات کو جمع کرتی اور ان کی اشاعت کرتی ہے، شاعری انھیں بروئے کار لاتی ہے، لہذا تنقید فلسفہ کی طفلی، اور شاعری تنقید کی طفلی بن جاتی ہے۔ بنا بریں آرنلڈ کا شاعری کو تنقید حیات کہنے کا مطلب نہ تو ”زندگی کو فکری اعتبار سے سمجھنا ہے“ نہ ”مخلصانہ انداز میں ادب پارے کو غور سے پڑھنا ہے“ بلکہ شاعری کا اس نظام خیال پر بنیاد رکھنا ہے، جسے تنقید نے پیدا کیا ہے۔

تنقید کا کام یہ ہے — اور یہ بنیادی کام ہے — کہ وہ اپنے دور کے نئے نظام خیال کی تشکیل نو کرے — ہر دور میں مختلف تاریخی دھاروں کے بہاؤ کی وجہ سے جو فکری، سماجی، معاشی اور تاریخی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں اور جن کی وجہ سے کلچر بدلتا رہتا ہے اور پرانا نظام خیال کمزور ہوتا اور ٹوٹتا پھوٹتا رہتا ہے۔ تنقید کا کام یہ ہے کہ وہ اس نظام خیال کو نئے سرے سے مرتب کرتی رہے تاکہ ایک طرف تغیر میں تسلسل باقی رہے اور دوسری طرف زندگی کے ہر شعبے میں تخلیق کا عمل جاری رہے۔

(ارسطو سے ایلپٹ ٹک، پیش لفظ)

ڈاکٹر جمیل جالبی تنقید کو آرنلڈ کی تقلید میں ایک ”ثقافتی عمل“ قرار دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں نیا نظام خیال پیدا ہوتا اور تخلیقی قوت کی بنیاد بنتا ہے، انھوں نے مغربی تنقید کے اہم نظریات کی تنقیص و شرح کے بجائے ان کے تراجم پیش کیے ہیں تاکہ نظریات کے اصل مطالب کو فی نفسہ سمجھا جاسکے اور نئی ذہنی فضا تشکیل پاسکے۔ دوسری طرف انھوں نے اپنی جملہ تنقیدی تحریروں میں آرنلڈ کے امتزاجی تنقیدی موقف کو پیش کیا ہے۔

آرنلڈ نے یہ نظریہ اصلاً ایک نعرے کے طور پر دیا تھا اور اس برطانوی معاشرے کو دیا تھا جو صنعتی کلچر کی وجہ سے افادیت پسندی کے جنون میں مبتلا ہو گیا تھا۔ آرنلڈ اس صورت حال کو انسانی عظمت و کمال کے منافی خیال کرتا تھا۔ آرنلڈ عظمت و کمال کا روحانی تصور رکھتا تھا، یہ تصور اپنی اصل میں قدیمی، مگر اپنے عمل میں جدید تھا۔ روایتی طور پر یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ جس معاشرے نے ابھی مادی ترقی کا سفر شروع کیا ہو نہ اس کے نتیجے میں افادیت پسندی کے جنون میں مبتلا ہوا ہو، اس معاشرے میں آرنلڈ کے نظریے کی کیا معنویت ہوگی؟ مگر ہم سمجھتے ہیں کہ اس طرز کے روایتی سوالات (جو اکثر ترقی پسند ناقدین کی طرف سے اٹھائے جاتے ہیں) ایک قسم کے خوف زدہ ذہنیت کی پیداوار ہوتے ہیں؛ بعض لوگ ڈرتے ہیں کہ ’فوری سماجی ضرورت سے غیر ہم آہنگ نظریہ‘ کہیں اس عمل میں خلل انداز نہ ہو جسے سماجی تعمیر و تشکیل کے سلسلے میں شروع کیا گیا ہوتا ہے۔ انھیں جس قدر اپنے نظریے کی صداقت پر یقین ہوتا ہے، اسی قدر دوسرے اور مختلف نظریات کی قوت کے سلسلے میں خوف بھی ہوتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ کسی ایک سماج میں، اس سماج کے سوالات کے جوابات کے طور پر تخلیق ہونے والے نظریات کو اپنے سماج میں معرض بحث میں لانے کے چند در چند اسباب ہوتے ہیں۔ (۵) انھیں آفاقی سمجھا جاتا ہے، اس لیے جتنے وہ اپنے سماجی تناظر میں

موزوں ہوتے ہیں، اتنے ہی وہ دوسرے سماج میں موزوں سمجھے جاتے ہیں۔ (ب) انھیں ’مقامی‘ سمجھا جاتا ہے، مگر ان کی تعبیر نوکر کے اپنی صورت حال سے ہم آہنگ کر لیا جاتا ہے۔ (ج) محض ذہنی جستجو اور علم میں اضافے کی خاطر انھیں سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پہلی دونوں صورتیں کم یا زیادہ نوآبادیاتی صورت حال کی پیدا کردہ ہوتی ہیں، جب کہ آخری صورت اس وقت ممکن ہوتی ہے، جب آدمی اپنے اندر علم کے لیے بے ریا تڑپ پیدا کرنے میں کام یاب ہو جاتا ہے۔ وہ نظریات کو فی نفسہ اہمیت دیتا اور انھیں ایک خالص انسانی سرگرمی سمجھتا ہے؛ وہ انسان کا تصور ایک سماجی حیوان کے طور پر نہیں ایک تجسس پسند روح کے طور پر کرتا ہے جسے ہر اس فکر، خیال، نظریے، تجربے سے دل چسپی ہوتی ہے جسے کہیں بھی اور کسی بھی زمانے میں کسی انسان یا سماج نے جنم دیا ہوتا ہے؛ وہ زندگی کو فوری ضرورتوں پر رد عمل ظاہر کرنے والی ایک جبلی ہستی نہیں سمجھتا؛ گہری، وسیع، زمانی، لازمانی انسانی احتیاجات پر تدبر کرنے والی حوصلہ پسند ہستی خیال کرتا ہے۔ بلاشبہ اس کے لیے ایک قسم کی ذہنی علیحدگی کی ضرورت ہوتی ہے! اس ذہنی علیحدگی کی وجہ سے نظریات کو ان کے اپنے تناظر، ان کی تاریخ اور دیگر نظریات کے مقابلے میں رکھ کر دیکھا جاتا ہے۔ اسی سے حقیقی دانش ورانہ رویہ جنم لیتا ہے۔

اس بحث کی روشنی میں دیکھا جائے تو نصابی نوعیت کی کتب میں مغربی تنقیدی نظریات اور دبستانوں کو بیش تر آفاقی سمجھ کر پیش کیا گیا ہے۔ نتیجتاً ان نظریات کو نہ تو ان کے ثقافتی اور علمیاتی تناظر میں رکھ کر سمجھا گیا ہے اور نہ ان نظریات کے باہمی تناقضات کو منظر عام پر لایا گیا ہے۔ ان کے مطالعے سے مغربی تنقید کے بارے میں منتشر، اور اکثر ناقص معلومات تو ملتی ہیں، مگر بصیرت نہیں ملتی۔ تسلیم کہ متعدد مغربی نقادوں اور ان کے معروف اقوال اور خیالات کا علم حاصل ہوتا ہے، مگر ان نقادوں کے ذہنی فریم ورک اور ان کے خیالات کی چھوٹی بڑی پرتوں اور ان پرتوں کو تشکیل دینے والے عوامل سے آگاہی نہیں ملتی۔ ان کتب کی تصنیف کے ”بنیادی راہ نما اصول“ مغربی تنقید کی اصل اور روح تک پہنچنے کا امکان نہیں رکھتے۔ تاہم بعض لوگوں نے مغربی نظریات کے اردو ادب پر انطباق کے حدود کی طرف توجہ ضرور دلائی ہے۔ سجاد باقر رضوی لکھتے ہیں:

..... یہ تمام اصول و نظریات من و عن اردو ادب پر منطبق نہیں کرنے چاہئیں۔ ان ادبی کاوشوں پر تو ان کا انطباق بہ آسانی ہو سکتا ہے جو مغرب کی تحریک پر ہی ہمارے یہاں پیدا ہوئیں، بالخصوص ان میں جہاں مغربی طرز فکر بھی نمایاں ہو، مگر ہمارا وہ ادب جو خالصتاً ہمارا ہے، اور مغربی اثرات کے باوجود جس حد تک نئی تحریکات کے ساتھ قدیم روایت کی شمولیت ہے، اس کے متعلق ہمیں پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہوگا۔

(مغرب کے تنقیدی اصول، ص ۷)

گویا سجاد باقر رضوی اس موقف کے حامی ہیں کہ تنقیدی اصول اپنی ماہیت میں ”داخلی“ ہوتے ہیں۔ وہ تخلیق کے داخل سے برآمد ہوتے یا کیے جاتے ہیں۔ لہذا تخلیق کے داخلی نظام یا شعریات کی تبدیلی سے تنقیدی اصول بھی بدل جاتے ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ کیا تمام تنقیدی نظریات ”داخلی“ ہوتے ہیں، ”خارجی“ نہیں ہوتے؟ ارسطو کے نظریات ”داخلی“ قرار دیے جاسکتے ہیں، مگر نفسیاتی تنقید، مارکسی تنقید، تاریخی، عمرانی تنقید، ساختیاتی تنقید کے بارے میں کیا رائے ہے؟ یہ تمام ”خارجی“ ہیں، انھیں دیگر علوم سے اخذ کیا گیا ہے، ان کے انطباق کی کیا صورت ہوگی؟ ان سوالات پر گہرا تامل ان کتابوں میں کہیں نہیں ملتا۔ اصل یہ ہے کہ ہر تنقیدی اصول

اور نظریے کی علمیات اور تناظر دونوں سے آگاہی ضروری ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہی اس کے انطباق کے حدود اور امکانات کا تعین کیا جاسکتا ہے۔

کسی نظریے کی تعبیر پیچیدہ عمل ہے۔ تعبیر کسی نہ کسی اصول، تناظر یا موقف کی روشنی میں ہوتی ہے۔ تعبیر کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو اصول، تناظر اور موقف کو اولیت دی جاتی اور نظریے کو ان سے ہم آہنگ بنایا جاتا ہے۔ یا پھر اولیت نظریے کو دی جاتی اور اصول، تناظر یا موقف کو اس کے تابع رکھا جاتا ہے، اس کی توسیع کی جاتی ہے۔ مغربی تنقید کی اردو میں نصابی کتب میں اس سوال پر بالعموم غور نہیں کیا گیا کہ مغربی نظریات کی تعبیر میں اولیت کس کو دی جا رہی ہے اور کس کو دی جانی چاہیے؟ عموماً مغربی نظریات کی تعبیر و تفسیر میں اپنے موقف کو اولیت دی گئی ہے اور نظریے کو اس سے ہم آہنگ بنانے کی کوشش کی گئی ہے اور جہاں یہ ہم آہنگی محال محسوس ہوئی ہے، وہاں نظریے کو مسترد کرنے میں مستعدی دکھائی گئی ہے۔ نیز جہاں موقف محض ایک تاثر ہے، وہاں کافی مضحک صورت پیدا ہوئی ہے۔ مثلاً آرنلڈ کے تنقید حیات، کے نظریے کی بیش تر تعبیر تاثر پر مبنی موقف کی روشنی میں کی گئی ہے۔ یہ تاثر دراصل تنقید کا عمومی مفہوم ہے: کھرے کھوٹے میں امتیاز! چنانچہ یہ سمجھا گیا کہ ادب کا کام زندگی کے خیر و شر میں امتیاز کرنا ہے، یہ مفہوم ادب کو اخلاقیات کے دائرے میں لے جاتا ہے اور ادب کی اپنی نہاد کو قائم نہیں رہنے دیتا۔ واضح رہے کہ ادب کی حقیقی نہاد اخلاقیات کے اصولوں کے الٹ یا منافی نہیں ہوتی، صرف مختلف ہوتی ہے۔ ادب، غیر اخلاقی نہیں، جمالیاتی ہوتا ہے۔ اخلاق اور جمال انسانی فطرت کے دو الگ دائرے ہیں جو ایک ہی شخص میں موجود ہوتے اور اس کی تکمیل میں اپنے اپنے اصولوں کے تحت مدد دیتے ہیں۔

اسی سے ملتی جلتی صورت ہمیں جیلانی کا مران کے یہاں بھی دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے مغرب کے تنقیدی نظریے (دو جلدیں) میں جہاں ۱۹۶۰ء کے بعد کی مغربی تنقید کو موضوع بنایا ہے، وہاں اپنے مذہبی ثقافتی موقف کو پیش نظر ہی نہیں مقدم بھی رکھا ہے۔ چنانچہ انھیں نئی تنقیدی تھیوری کو قدم قدم پر ہدف تنقید و طعن بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ طعن سے بالعموم وہیں کام لیا جاتا ہے جہاں مصنف اپنے موقف کو ایک علمی معاملے کے بجائے، ایک ایسا اقداری تصور قرار دے جس کے منہدم ہونے کا اندیشہ بھی ہو۔ جیلانی کا مران نے جہاں جہاں تنقیدی تھیوری کے بنیادی تصورات پر لکھا ہے، وہاں انھیں مسلسل اپنے تہذیبی موقف کو ان کے مقابل ظاہر کرنے کی ضرورت کا دباؤ محسوس ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تھیوری کے کسی ایک تعقل کو اس کے اصل تناظر میں واضح کرنے سے پہلے ہی اپنا موقف تھیوری کی ادھوری اور بعض صورتوں ناقص تفہیم پر لا دیتے ہیں۔ اس سے عجب مضحکہ خیزی کی صورت سامنے آتی ہے۔ صرف ایک اقتباس دیکھیے:

ژاکو دریدانے ڈی کنسٹرکشن (حقائق کی نئی تشکیل) کے بارے میں کہا ہے کہ متوازی اور برعکس (Reverse) کیفیت بھی شے پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ مطالعے کے مسائل اور نشانیات کے آڑے ترچھے خدوخال کسی خاص منزل تک رہنمائی نہیں کر سکتے اور ژاکو دریدا کے تشکیلی تجربے میں بھی محض اقدار کے دوسرے رخ کا مشاہدہ بھی کوئی مفید مقصد بھی فراہم نہیں کرتا۔ الفاظ اور شعور کا باہمی فاصلہ برابر قائم رہتا ہے، اور متن پوری طرح مطالعاتی عمل کی گرفت میں نہیں آسکتا۔ گئی فائر اور گئی فائیڈ کے کبھی ختم نہ ہونے والے سلسلے سے کوئی منزل تب تک برآمد نہیں ہو سکتی جب

تک کہ یہ سلسلہ کسی میٹا فزیکل تصور کائنات یا مذہبی افکار کی صداقتوں کو اپنی بیرون ترین سرحد کے طور پر قبول نہیں کرتا۔ لیکن ڈاکو دریدا ایسے کسی خارجی اور ماورائی حدود اربعے کو تسلیم نہیں کرتا اور جب اس کا آخری لگنی فائر نمایاں ہوتا ہے تو وہ ایک سکوت بسیط کے کناروں تک پہنچ جاتا ہے۔

(مغرب کے تنقیدی نظریے، جلد ۲، ص ۲۴۴)

ڈی کنسٹرکشن کو حقائق کی نئی تشکیل کہنا، ایجاد بندہ ہے۔ ڈی کنسٹرکشن متن کی ایک خاص صورت حال یا وقوعہ ہے؛ اسے نقاد متن پر مسلط نہیں کرتا، اس کو اپنے مطالعے کے دوران میں دریافت کرتا ہے۔ اس کے مطابق متن کے ایک معنی کے التوا کا سامان خود اسی متن میں مضمر ہوتا ہے۔ جہاں تک متوازی اور برعکس کیفیت کے متن کے معانی پر اثر انداز ہونے کی بات ہے تو یہ ایک فکر انگیز بات ہے۔ بہت سادہ مثال سے اسے ہم سمجھ سکتے ہیں۔ مرد اور عورت یا رات اور دن ایک دوسرے کے ضد مخالف ہیں۔ ہم مرد اور دن کے معانی، ان کے برعکس لفظوں عورت اور رات کے مقابل رکھ کر قائم کرتے ہیں، خواہ وہ ہماری گفتگو میں نہ آئیں۔ اسی طرح مشرق کا تصور مغرب کے مقابل کیا جاتا ہے؛ ایک کی مثبت خصوصیات، دوسرے کی منفی خصوصیات کے متوازی قائم کی جاتی ہیں۔ انھیں آپ آڑے ترچھے مسائل کہہ کر ان سے جان نہیں چھڑا سکتے۔ دریدا چوں کہ معانی کے لامتناہی التوا کا قائل ہے، اس لیے کسی متن کی حتمی تفہیم کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔ اس بحث میں مذہبی افکار کی صداقت کو لانا، اس خوف کا اظہار ہے کہ کہیں معنی کی لامتناہی تکثیریت مذہبی فکر کی وحدت کے تصور پر اثر انداز نہ ہو۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ ادبی متن کے مطالعے کی طریقوں کی بحث میں مذہبی فکر کی وحدت کے متاثر ہونے کا ہمیں خوف کیوں لاحق ہو جاتا ہے؟ یہی نہیں اس خوف کا غلبہ اس درجہ کیوں ہوتا ہے کہ ہم ادبی متن کے مطالعاتی طریقوں کی ان کے حقیقی تناظر میں صراحت ہی سے قاصر ہوتے ہیں؟ جیلانی کامران نے دریدا کی ناقص تفہیم ہی پیش نہیں کی، اپنے موقف کا بے محل اور بے محابا اظہار کر کے دریدا کی غلط تفہیم بھی کی ہے۔ ڈی کنسٹرکشن کے کتنے ہی تنقیدی و تعبیری مضمرات ہیں، ان سے اختلاف کی گنجائش بھی ہے، اس طرف توجہ نہیں دی گئی۔ یہ صورت تنقیدی تھیوری کے دیگر مباحث کے سلسلے میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہاں دریدا کا نہیں، خالص علمی و تنقیدی مباحث کی طے شدہ رسمیات کا دفاع مقصود ہے۔

مغربی نظریات کو ان کے اپنے تناظر، تاریخ اور دیگر نظریات کے مقابلے میں رکھ کر دیکھنے کی مثالیں ہمیں ان کتابوں میں ملتی ہیں جنہیں نصابی کتب کے طور پر تصنیف نہیں کیا گیا۔ کلیم الدین احمد، آل احمد سرور، احتشام حسین، محمد حسن، محمد حسن عسکری، وزیر آغا، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمن فاروقی، ضمیر علی بدایونی، قاضی افضل حسین، ابوالکلام قاسمی، عتیق اللہ، فہیم اعظمی، سہیل احمد خاں اور حامدی کاشمیری کی تنقیدات میں ہمیں مغربی تنقید کے تصورات کو ایک واضح زاویہء نظر سے پیش کرنے کا رویہ ملتا ہے۔ بلاشبہ ان سب ناقدین کی مغربی تنقید کی تشریحات سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے، مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے مغربی تنقید کے بنیادی اور اہم متون کو بنیاد بناتے ہوئے اردو شعریات سے متعلق ثقافتی اور جمالیاتی سوالات کے جوابات تلاش کیے۔

حواشی

- ۱- مثلاً چند کتابوں سے یہ اقتباسات دیکھیے :
 ”تنقیدی دبستان“ ہر طرح کی تعلیٰ کے بغیر پیش کرنے کے باوجود تنقید کے پرچہ میں ۳۳ فی صد نمبر دلانے کا تو میں ذمہ لیتا ہوں۔“
 (ڈاکٹر سلیم اختر، تنقیدی دبستان، ص ۸)
 ”میری رائے ہے کہ اس کتاب کے مطالعے سے نہ صرف ادب کے طالب علموں کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوں گی، بلکہ ایک عام قاری بھی اس کے مطالعے سے خوشی محسوس کرے گا۔“
 (جیلانی کامران، مغرب کے تنقیدی نظریے، جلد اول، ص ۱)
 ”بنیادی طور پر میں نے یہ کتاب طالب علموں کی ضروریات کے پیش نظر تالیف کی ہے۔“
 (سجاد باقر رضوی، مغربی کے تنقیدی اصول۔)
- ۲- تاہم یہ ایک چشم کشا امر ہے کہ ممتاز لیاقت نے بکف چراغ دارد میں سجاد باقر رضوی اور سید وقار عظیم کے دو مضامین بالترتیب، ہنسی کے متعلق عرب حکما کے چند نظریات اور تاریخی ناول اور اس کا فن کو الفرڈ ٹریسڈ شپرڈ اور فرائز روزن تھل کی کتابوں کے تراجم ثابت کیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: بکف چراغ دارد صفحات ۸ تا ۱۱۰ اور ۱۱۱ تا ۱۳۱
- ۳- جیلانی کامران کی کتاب مغرب کے تنقیدی نظریے میں بعض مقامات پر تناظر کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس کی بجائے طور پر تشبین کی جانی چاہیے، تاہم کئی مقامات ایسے بھی ہیں جہاں تناظر کو نظر انداز کیا گیا ہے۔